

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

اسلام نے جس طرح اپنے نظام میں انسان کے فطری واجیات کا پورا پورا اہتمام کیا ہے اور کوئی چیز اسی پیش نہیں کی جو اس کی فطرت سے میل نہ لگاتی ہو بالکل اسی طرح اُس نے اپنی تعلیمات لوگوں کے ذہن نشین کرانے کے لیے استدلال کے قریب قریب وہی طریقے اختیار کیے ہیں جو عام فہم ہیں اور انسانی عقل و فکر سے مناسبت رکھتے ہیں۔ اگر انسان کے دل و دماغ کو تعصبات اور ذاتی اغراض نے بالکل مآؤف نہ کر دیا ہو تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ کوئی شخص انہیں سنے اور دین حق کو قبول کرنے سے اعراض کرے۔

”عام فہم“ کا لفظ سن کر کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم الہامی طرز استدلال اور انہام تفہیم کے عام طریقوں میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔ مالک الملک جس احسن طریق سے اپنے بندوں کو سمجھا سکتا ہے کوئی دوسرا اُس کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ ان الفاظ سے ہماری مراد صرف یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے انسانی فطرت کا لحاظ رکھتے ہوئے استدلال کے وہی انداز اختیار کیے ہیں جن سے ہمارے دل و دماغ بالعموم آشنا ہیں اور پھر ان کے انداز عجاز کی شان پیدا کی ہے۔ یہ چیز ایک انسان ہونے کی حیثیت سے ہمارے مناسب حال بھی ہے۔ اس ذات بے ہمتا نے افسانوں کی ہی ایک زبان میں فصیح و بلیغ کلام نازل فرمایا جس کی کوئی نظیر نہیں پیش کی جاسکتی اور جسے دیکھ کر خود ایہ احساس ہو جاتا ہے کہ یہ کسی مخلوق کا کلام نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ الہامی کتاب کسی غیر انسانی زبان میں ہی نازل ہوتی تو نوع بشری کے لیے اس کے عجاز کو جاننا محال ہوتا۔ اسی طرح اگر انبیاء علیہم السلام نوع انسانی میں سے مبعوث نہ ہوتے اور ہماری انتہائی کاغرض فرشتوں کو سونپ دیا جاتا تو ہم کبھی اتمام محبت نہ ہوتا۔ یہی وہ اصل وجہ ہے جس کی بنا پر انسانوں ہی میں سے بعض بزرگ و ترستیموں کو نہایت سے سزا دی گئی تاکہ وہ لوگوں میں رہ کر معاشرتی

ذمہ داریوں سے لکر، انسانی کمزوریوں سے پوری طرح واقف ہو کر خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچائیں اور انسانی فطرت کے محرم راز بن کر اُن کی اس طرقتی سے تہذیب کریں کہ وہ اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی آخرت کی تیاری میں مصروف رہیں۔

اسلام نے اپنی تعلیمات لوگوں کے دلوں میں اتارنے کے لیے بھی یہی فطری اصول پیش نظر رکھا ہے اور غور و فکر اور بحث و استدلال کے انہیں مزوجہ طریقوں سے کام لیا ہے جن سے نوع بشری فطری طور پر واقف چل اُڑ رہی ہے۔ البتہ اُن کی ترتیب کا جو انداز اُس نے اختیار کیا ہے وہ فنیہا مثال ہے اور اس میں اعجاز کی پوری شان بھلکتی ہے۔

ان صفحات میں آج ہم قرآن مجید کے طرز استدلال پر ہی چند گزارشات پیش کریں گے۔

کسی اصول یا نظریہ کی صحت کے لیے لوگ عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ لازماً کسی خارجی دلیل کا محتاج ہے۔ مگر دنیا میں بے شمار حقائق ایسے ہیں جن کو ہم فطری طور پر مانتے چلے جاتے ہیں اور ان کی صداقت کے بارے میں ہمیں کبھی شک و شبہ نہیں گزرتا۔ اُن کا اقرار ہماری فطرت میں داخل ہوتا ہے اور انہیں تسلیم کرنے کے لیے ہمارا وجدان ہم سے مطالبہ کرتا ہے۔ مگر ہم ان بدیہی حقائق کو تسلیم نہ کریں تو ہم اپنی زندگی میں ایک خلا محسوس کرنے لگے ہیں۔

وجودِ خالق کے اعتقاد کو بھی قرآن مجید اپنی بدیہی حقائق میں سے ایک بڑی حقیقت سمجھتا ہے۔ اعتقادِ فطرت، انسانی کا ایک لازمی جزو ہے اور دلائل و براہین کی ترتیب و تدوین سے قبل ہی انسان کے دل و دماغ میں راسخ ہو چکا تھا۔ ایک انگریز لکھے، ایک اُن پرہیزگار، ایک تعلیم یافتہ ہندو یا افریقہ کے کسی وحشی یا کسی عالم و فقیہ سے پوچھتے کہ خدا کیا ہے اور پھر اُن کے جوابات کو غور سے دیکھتے تو سب کی زبانیں ایک ہی بات نظر آئے گی یعنی کسی بلند مقام و الانفیات کا تصور جو اس کا نام نہاد کی عفت اولیٰ ہے۔ مگر

میکڈانڈ جو مدت تک افریقہ کی وحشی قوموں میں رہے ہیں اپنی کتاب "افریقہ" میں لکھتے ہیں کہ ان سب کا اس پر اتنا یقین ہے کہ کوئی شے ایسی ضرور ہے جو اس جسم سے الگ ہے اور اس کائنات کا منبع و مبداء ہے آخر انسان کے اندر وہ کونسا ایسا احساس تھا جس نے انسان کو مظاہر قدرت کے سامنے جھکا دیا، وہ کیا چیز تھی جس نے اس سے بادل کی گرج اور بجلی کی چمک کے سامنے سجدہ کرایا، وہ کیا تھا جس نے اس کو تلاطم خیز دریاؤں یا سرخسلیک پہاڑوں کے سامنے سر نیز خم کرنے پر مجبور کیا؟ کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ ڈر ہے۔ ڈر تھا تو وہ بھاگ جاتے، پھپھ جلتے لیکن اس کے بجائے انہوں نے ایک ایسی قوت کو مانا جو ازل سے ابدی ہے۔ موت سے ڈر تھا تو وہ مرنے سے ڈرتے لیکن انہیں روح کا خیال کس طرح پیدا ہوا غائبی کائنات کا احساس تو ان بچوں تک میں پایا گیا جو امگ نعلنگ رکھے گئے جنہیں کسی قسم کی کوئی بات نہیں بتائی گئی اور نہ صرف بچوں میں بلکہ بہرے گونگوں نے بھی کسی خارجی امداد کے بغیر صرف اپنے وجدان کے مطالبے پر اس تصور کی تائید کی۔

انسان لاکھ سو مارے گردہ اس ساعت کو کبھی متعین نہیں کر سکتا جب اس کے اندر وجود خالق کے احساس نے جنم لیا تھا یہ سب شواہد اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ یہ اعتقاد کسی نہیں بلکہ وہی ہے اور خود بخود ہمارے نفس میں فطرت نے ودیعت کر رکھا ہے۔ اس بنا پر یہ عقیدہ کسی خارجی دلیل کا محتاج نہیں بلکہ یہ نفس الامر کی حقیقت ہے جس کو انسان بغیر کسی رد و تکد کے تسلیم کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ گویا یہ تصور انسان کی گھٹی میں داخل ہے جس طرح وہ اپنے آپ سے باہر نہیں نکل سکتا اور اپنی حدود اور قیود کو توڑ نہیں سکتا اسی طرح ایمان باللہ سچا بتدائے آفرینش سے اس میں جاگزیں ہے۔ وگرنہ وہ انہیں کی جاکتی۔ اسی حقیقت کو قرآن مجید اپنے بیگانہ انداز میں یوں پیش کرتا ہے،

إِنِ اللّٰهُ مَلَكَ مَا طَرَفَ السَّمٰوٰتِ ۚ
 (ابراہیم: ۴) ہے ؟

اَلَاۤ اَرٰیۤ اَنۡ اَخۡرَجُوۡنَا فِی اللّٰهِ دَہُوۡمًا تَبٰۤا وَّ
 کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو جو ہمارا
 اور تمہارا رب ہے ؟

خدا کے وجود کا اعتراف چونکہ انسان کے فطری تصورات اور وجدانی جذبات میں داخل ہے اس لیے وحی الہی نے اس کو فطرت سے تعبیر کیا ہے۔

فَإِنَّمَا وَجَّهْتُ لَدَيْنِ حَبِيبَا فِطْرَةَ
اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا. لَا تَبْدِيلَ
لِخَلْقِ اللّٰهِ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِن
أَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ

اپنا رخ سب طرف سے پھیر کر دین کی طرف کر دینے
خدا کی وہ فطرت ہے جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا
کیا۔ خدا کی خلقت میں تبدیلی نہیں یہی سیدھا اور
ٹھیک دین ہے لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔

قرآن مجید اسی بدیہی حقیقت کو ایک دوسرے مقام پر درجہ انزل کے اُس عہد و پیمان سے تعبیر کرتا ہے جو خالق و مخلوق کے درمیان ہوا تھا۔ یہ اسی عہد و پیمان کا احساس ہے جو انسان کی رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے اور ہزار انکار کے باوجود انسانی فکر و عمل کے مشیہاگرگوشتوں میں اس کے اثرات بھٹکتے نظر آتے ہیں۔

وَاِذَا اخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي اٰدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ فَاَشْهَدَهُمْ عَلَى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلٰى شَهِدْنَا

اور جب تیرے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے اُن کے نسل کو نکالا تھا اور خود ان کے اوپر گواہ بنانے پر چھٹا تھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ انہوں نے کہا ہاں، ہم گواہ ہیں۔

(اعراف-۲۲)

کلام الہی کا مطالعہ کیجئے تو آپ کو اس طرز استدلال کے بیشمار نمونے ملیں گے۔ قرآن مجید کا شاید ہی کوئی مضمون ایسا ہو جس میں انسان کی اس خطری پکار کی طرف اشارہ دیا ہو۔ یہ دلیل سب سے قوی اور سب سے زیادہ مضبوط ہے کیونکہ یہ انسانی روح کا بنیادی تقاضا ہے۔

میں اپنی ہستی کے ثبوت کے لیے کسی منطقی دلیل کا محتاج نہیں۔ یہ ایسی معرفت طبعی ہے جو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ آخر میری ہستی کا ثبوت میری معرفت طبعی سے بڑھ کر ادا کیا ہو سکتا ہے۔ اگر یہ معرفت میری عقلی اور اخلاقی قطعت کے لیے کافی نہیں تو پھر دنیا کا کوئی منطقی استدلال

اور کوئی دلیل کافی نہیں ہو سکتی۔

جب میں نے اس امر کو جان لیا کہ میں ہوں اور میں اپنی ہستی کا خود باعث نہیں تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں کیسے یہاں آیا۔ یہ کہنا کافی نہیں کہ میرے وجود کے پہلے اور اسباب تھے اور اُن سے پہلے اور اُن سے پہلے اور۔ اگر وہ سبب ان کے بعد آیا جو میری تخلیق کا سبب نہیں تو میں بے سبب ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی ذات ایسی ہے جو ان اسباب کو ترتیب دیتی ہے۔ لہذا میری علتِ تخلیق کوئی اور ہے جو ان سبب بالاسے۔ یہ منطقی نتیجہ ہے اس بدیہی تحقیق کا کہ میں ہوں اور میں اس امر کو جانتا ہوں۔ جب میں موجود ہوں اور مجھے اپنے وجود کے بارے میں کوئی شک نہیں گزرتا تو پھر اپنے خالق و مالک کے وجود کے متعلق میں کیوں کسی شبہ میں گرفتار ہوتا ہوں۔ اُس ذات باری تعالیٰ کا وجود بھی اسی طرح کی ایک ٹھوس حقیقت ہے جس طرح کہ میں۔ اور یہ ساری کمالات جس میں میں زندگی بسر کر رہا ہوں جب مخلوق کا وجود بغیر کسی کے نہیں ممکن ہے تو خالق کے وجود کا بھی ایک بدیہی تحقیق کے طور پر پہچان کرنا چاہیے۔ اسی حقیقت کی طرف قرآن مجید نے ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے :

أَمْ خَلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمْ
الْخَالِقُونَ؟ أَمْ خَلَقُوا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ
بَلَى لَا يُؤْمِنُونَ (طہ: ۴۸)

کیا کسی اور چیز نے انہیں جائزہ خلقت عطا کیا ہے یا وہی اپنے آپ کے خالق ہیں، یا اُن ہی نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا ہے (یہ کوئی بات نہیں، بلکہ ان کو یقین نہیں ہے۔)

اسی ضمن میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی اس فطری پکار کی طرف ایک دوسرے زاویہ نگاہ سے بھی بحث کی ہے۔

عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ جب انسان خوشحال ہو، جب زندگی کے آلام و مصائب اُسے پریشان کر رہے ہوں تو اُس کی طبیعت میں غفلت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی کامیابیوں اور کامیابیوں کو اپنی قابلیت و استعداد پر محمول کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے اندر انایت کے جذبات بھی ابھرنے شروع ہوتے ہیں اور وہ اپنے مالک اور خالق سے غفلت و دور ہو جاتا ہوتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے

کہ میں کسی کا محتاج نہیں بلکہ یہ ساری کائنات میرے وجود کی محتاج ہے۔ سب میرے سامنے دستِ سوال دراز کرنے پر مجبور ہیں اور مجھے کسی کے سامنے سجدہ ریز ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ بالکل غیر مسئول ہوں کوئی مجھ سے باز پرس کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے انسانی فطرت مسخ ہونا شروع ہوتی ہے اور اُس کے اندر اپنے مالک کو پہچاننے کی صلاحیت بھی باقی نہیں رہتی۔

انسانی فطرت و حقیقت اُس وقت مکھر کر سامنے آتی ہے جب کسی انسان کی جان پر آجئے، جب شائد و مصائب اُس پر ہر طرف سے هجوم کریں اور وہ ان کی یلغار کے سامنے بالکل بے بس ہو، جب عقل اپنی ساری چابکدستیوں کے باوجود قطعاً یکاثر ثابت ہو رہی ہو۔ اس موقع پر انسان اپنے سارے حجابات دور کر کے اپنے اصلی رویہ میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ پھر اُس کی انسانیت بھی سرنگون ہوتی ہے اور وہ اس بات کے لیے مضطرب ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو مالکِ خقیقی کے حوالے کر دے جو زندگی کا سب سے بڑا سہارا ہے اور جس کی طرف رجوع کرنے کے بعد انسان سارے دنیاوی سہاروں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

اِذَا يَتُحَرَّنَ اَتَكُمُ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ
اَتَكُمُ السَّاعَةُ اَعْبَدَ اللّٰهُ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ
كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ- بَلْ اِيَّاہُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ
مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْہِ اِنْ شَاءَ وَتَنْتَسُوْنَ مَا
تُشْرِكُوْنَ۔ (الانعام - ۳۰)

ذرا غور کر کے تباؤ، اگر کبھی تم پر اللہ کی طرف سے کوئی
بڑی مصیبت آجاتی ہے یا آخری گھڑی آپہنچتی ہے
تو کیا اس وقت تم اللہ کے سوا کسی اور کو پکارتے ہو؟
ہر دو اگر تم سچے ہو۔ بلکہ اُس وقت تم اللہ ہی کو پکارتے
ہو، پھر اگر وہ چاہتا ہے تو اس مصیبت کو تم پر سے
ٹال دیتا ہے۔ ایسے موقعوں پر تم اپنے ٹھیرائے ہوئے
شرکیوں کو بھول جاتے ہو۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ انسان کی اس نفسیاتی کیفیت کو ایک دوسرے پر ایہ میں یوں بیان فرماتا ہے :

هُوَ الَّذِي يُبَيِّنُ لَكُمْ فِي الْكِتٰبِ مَا لَكُمْ مِنَ الدِّنِّ وَ يَخْبَرُكُمْ فِي الْمَوَاقِعِ
وہ اللہ ہی سے جو تم کو خشکی اور تری میں چلاتا ہے

حَتَّىٰ إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلِ ۖ وَجَبْنَ يَهُودِيٌّ مِّنْ
طَيْبَتُمْ ۖ فَمَرَّحُوا بِمَا جَاءَتْهُمْ مِّنْ غَايِبٍ
وَجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ حَتِّ مَكَانٍ ۖ وَطَسُّوا
أَنفَهُمْ ۖ خَبِطَ بِهِمْ ۖ ذَعَرُوا ۖ اللَّهُ
مُخْلِصِينَ لَهُمُ الْمَدِينَةَ ۖ لِيَنُجِّيتَنَّهُ
مِنْ هَٰذِهِ ۖ لَنُكَوِّنَنَّ مِنَ الشَّكْرِ

رِیَاض (۳)

چنانچہ جب تم کشتیوں میں سوار ہو کر بلادِ موافق پر پہنچا
شاداں سفر کر رہے ہوتے ہو اور پھر ایک باد
مخالف کا زور ہوتا ہے اور ہر طرف سے موجوں
کے ٹھیسرے لگتے ہیں اور مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان
میں گھر گئے، اس وقت سب اپنے دین کو اللہ ہی
یہے خالص کر کے اس سے دعائیں مانگتے ہیں کہ اگر
تو نے ہم کو اس بلا سے نجات دے دی تو ہم شکر گزار
بندے بنیں گے۔

انسان کے دل میں یہ احساس کہ اس عالم مجاز و محسوسات سے بالاتر، ہمارے نظام کائنات سے
ارتع و اعلىٰ ایک آن دیکھا نظام موجود ہے۔ ہمارے دل میں ایک جلی سی لے کی طرح ہمیشہ موجود رہتا ہے۔
بقول ڈاکٹر اشپرنگر کسی کے ہاں اس سے زلزلہ و طوفان اٹھتے ہیں، کسی کے اندر اس سے ظندرانہ وجود
حال پیدا ہوتا ہے۔ کسی کے دل میں یہ اس خاموشی سے مجروح ہوتا ہے کہ اسے اس کی گہرائی یا سطحیت کا
شعور تک نہیں ہوتا۔ لیکن ہر صورت میں اس کی موجودگی ایک امر واقعہ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ خود اس
” دیکھے بھالے، بن سو بھے جانے پہچانے، بن بو بھے

وجود کا احساس انسان کے نفس میں کیونکر ہوتا ہے۔ اتنی بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری ہر شعوری
کیفیت کے لیے ایک معروض کا وجود ضروری ہے۔ اگر غصہ آئے گا تو کسی بات یا شخص پر، اگر
مسترت کی لہر دوڑے گی تو کسی چیز یا خیال سے احترام کے جذبات موجزن ہونگے تو کسی شخص کے لیے
غرض کہ ہر نفسی کیفیت کے لیے ایک معروض ضرور ہونا چاہیے۔ یہ معروضات محسوس اشیاء بھی ہو سکتی
ہیں اور غیر محسوس اشیاء بھی۔ دونوں سے یکساں طور پر شعوری کیفیت تحرک پا سکتی ہے۔ بسا اوقات
مسترت کا خیال جس طرح ہمارے دل میں لگتا ہے، اسی طرح ہمارے دل میں لگتا ہے۔ ایمانی کیفیت کا معروض

اسی طرح کی ایک آن دیکھی حقیقت ہے جن کا احساس دل کی گہرائیوں میں ہر وقت موجود رہتا ہے مگر ہم اُسے حواس کی گرفت میں نہیں لاسکتے اور انسان کی حالت کچھ اس طرح کی ہوتی ہے

دل من داند، ومن داند، و داند دل من

اس آن دیکھے وجود کے احساس کی مثالیں ہمیں زندگی میں ہر طرف ملتی ہیں۔ خود ان لوگوں میں بھی جو ایمانی کیفیت پیدا کرنے کی کوئی خاص مشق یا کوشش نہیں کرتے، یہ احساس موجود رہتا ہے کہ کوئی عظیم و خیر ذات ہمیں دیکھ رہی ہے، کوئی نادر مطلق سستی ہمارا احاطہ کیے ہوئے ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر اوقات دل کی انجان گہرائیوں میں آنکھرنے والے محسوسات آلود خیالات اس چشم ہمہ میں کے احساس سے دب جاتے ہیں جب کہ دنیاوی گرفت و مواخذہ کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔ چور متاع غیر پر ہاتھ ڈالتے ہوئے کانپ اٹھتا ہے اور اُسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی زبردست ہاتھ اُسے پکڑ کر اس فعل سے باز رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسی طرح جب انسان مصائب میں گرفتار ہو کر گھبرا اٹھتا ہے اور ان کے چنگل سے نکلنے کی کوئی امید اچھے نظر نہیں آتی تو وہ ہسے ہوئے بچے کی طرح لاشعوری طور پر اُس آغوش کی طرف پکتا ہے جو رحمت سے لبریز ہے اور جہاں سے کبھی کوئی شخص ناکام و نامراد واپس نہیں گیا۔

اس آن دیکھی سستی سے کوئی شخص جتنا زیادہ تعلق پیدا کرے اُسی نسبت سے اُس کے لیے یہ ذات دیکھی بھالی سمجھی و صحیح حقیقتوں سے زیادہ حقیقی چیز بن جاتی ہے اور صفاتِ الہی رحیمی و کیمی، جبرائیت و مہاربت، عدل و احسان محض تصورات نہیں بلکہ محسوسات بن کر دنیا میں ہر طرف محیط نظر آتے ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ چیز بھی ذہن نشین رہے کہ قرآن مجید نے صرف انسان کے اس وجدانی احساس کی طرف اشارہ کر دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اُس نے دلائل و براہین سے اس حقیقت کو ثابت بھی کیا ہے۔ اُس نے جہاں انسان کے اس بندہ بظنوت کو ابھارا ہے کہ ایک ازلی مابدی ذات اس کائنات کی خالق و مالک ہے اور اسی کی مشیت اور ارادہ سب پر حاوی ہے، وہاں اس نے اس امر کا بھی پورا پورا اہتمام

کیا ہے کہ یہ جذبہ خارجی اثرات سے دہنے نہ پائے اور اگر کبھی دب جائے تو غور و فکر کی قوت اسے مسلسل ابھارتی رہے اور اس طرح یہ زیرِ خاکِ کتراگ بھرک کر انسان کے اندر ایمان کی حرارت اور یقین کا سونڈ پیدا کرے۔ اسی مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے انفس و آفاق میں ایسی نشانیاں رکھی ہیں جن سے ذاتِ باری تعالیٰ کے وجود کی نہایت واضح شہادت فراہم ہوتی ہے:

بَلِ الْإِنْسَانِ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۚ وَكُو
الْفَقِ مَعَادِيرُهُ - (۱-۴۵)

انسان خواہ (ہزار) بہانے بنانا پھرے مگر وہ اپنے
لیے خود دلیل ہے۔

سَمُرْتُهُمْ أَتَيْنَا فِي الْأَفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ
حَقٌّ تَبَيَّنَ لَهُمَا أَنَّهُ الْحَقُّ - (۶-۴۱)

ہم عنقریب اُن کو آفاق و انفس میں اپنی نشانیاں
دکھائیں گے۔ یہاں تک کہ اُن پر واضح ہو جائے کہ
تحقیق حق یہی ہے۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُؤْمِنِينَ وَفِي
أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ (زمرہ ۱)

ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے نفسِ انسانی کے متعلق غور و فکر کے لیے ایک صحیح نقطہ نظر
کی نشاندہی بھی کر دی ہے۔

الْبَدْيَ أَحْسَنَ كُلِّ شَيْءٍ وَخَلَقَهُ وَبَدَأَ
خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ - ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ
مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ مَاءٍ مَهِينٍ، ثُمَّ سَوَّاهُ
وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُوحِهِ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ
الْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ

وہی (ذاتِ پاک ہے) جس نے جو چیز بنائی خوب بنائی
اور انسان کی پیدائش مٹی سے شروع کی پھر اس کی
نسل ذلیل نچڑے پانی سے بنائی۔ پھر اس کو سڈول
کیا اور اس میں اپنی جان سے کچھ بھڑک دیا اور ہمارے
یہ کان اور آنکھیں اور دل بنا دیئے ہم ان احسانوں
کا بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔ (سجده ۱۰)

کائنات کے اس وسیع و بچیدار طلسم میں سب سے عجیب و غریب سہتی غور و انسان ہے۔ مشتِ خاک
سے اُس کی پیدائش کا آغاز ہوا۔ جس طرح انسان نے اپنے اندر ایمان کی حرارت اور یقین کا سونڈ پیدا کر کے

جسم کا سڈول اور متناسب بن جانا، پھر اس مٹی کے مودہ قالب میں دفعتاً کہیں سے زندگی آجانا اور اس میں علم و حواس اور شعور و آگہی کی حیرت انگیز قدرتیں اور صلاحیتیں پیدا ہو جانا سب خالق کے وجود کی زندہ شہادتیں ہیں۔

انسان کی ساخت پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ وہ ناقابل احساس عزت و کثمتہ سازی نہیں بلکہ کسی خالق و مالک کی تدبیر کا نتیجہ ہے۔ اگر ہم تسلیم کر لیں کہ انسان کی پیدائش میں سوائے مادہ کے اور کسی ذات کا دخل نہیں تو پھر پہلے قدم پر ہی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مادہ کی غیر معین توانائی کے بطن سے معین مظاہر کیسے پیدا ہو گئے۔ انسان کے جسم میں ایک حسن ترتیب ہے جو کسی مرتب کے فوہی جمال کی آئینہ دار ہے۔ مادہ کے اندھے ہیرے لزوم سے تو یہ چیز قطعی طور پر ناممکن ہے پھر انسانی جسم کے تمام اعضاء میں ایک تناسب کی موجودگی اور مختلف خدمات کے لیے اُن کی اہلیت و استعداد، اس تحقیق کی غمازی کر رہی ہیں کہ اس کائنات میں شریع ہی سے ایک قدرت مائلہ اور قوت رابطہ موجود ہے جس نے مادہ کے مختلف ذرات کو باہم جوڑ کر انہیں ایک انسان کی شکل عطا کی۔ اور پھر اس انسان کے قطرہ آب سے اس کی نسل کو آگے بڑھانے کا انتظام کیا اور اس میں بھی تعجب انگیز بات یہ ہے کہ مختلف انسانوں کے مختلف سانچوں میں ڈھالا۔ اگرچہ اعضاء کے اعتبار سے سب انسان یکساں ہیں مگر ان اعضاء کے مابین تناسب کا رشتہ ہر انسان میں الگ الگ پایا جاتا ہے جو اُسے دوسرے انبائے جنس سے مبینہ کرتا ہے۔ فطرت کی یہ ساری رنگارنگی کسی گہری تدبیر کی شہادت دیتی ہے۔ اگر انسان سازی کے اس وسیع و عریض کارخانے کو صرف مادہ کا عمل سمجھ لیا جائے تو پھر فکری دلیل حیران ہے کہ بے مضبوطی سے متناسب صومئیں کس طرح پیدا ہو گئیں، وحدت کثرت میں کس طرح جلوہ گر ہوئی۔ یہ سوالات ایسے ہیں جن کی آپ طبیعات یا کیمیا سے توجیہ نہیں کر سکتے۔ ان کی سیح توجیہ اس اصول کو تسلیم کرنے سے ہی ممکن ہے کہ انسان سازی کے یہ سارے کرشمے کسی عزم حیات کے مظاہر ہیں۔

اصول موضوعہ سے ممکن نہیں عناصر میں ظہور ترتیب سے انسانی شکل تو بن سکتی ہے مگر اس میں شعور و آگاہی کا پیدا ہونا ایک لایحل مسئلہ ہے۔ انسان بار بار سوچتا ہے کہ آخر مادہ کی اندھی قوت نے شعور و ادراک کو کیسے جنم دیا۔ شعور بے شعوری کا غلاف چاک کر کے کیونکر ظاہر ہو گیا پھر خود بے شعور اس توانائی سے کس قدر مختلف ہے جس سے وہ، کہا جاتا ہے، کہ پیدا ہوا ہے۔ یہ سب چیزیں بڑی ہی حیران کن ہیں اور سائنس ان کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں دے سکتی۔

بعض لوگ بڑی مبہمائی سے یہ کہتے ہیں کہ ذہن و شعور مادہ کی ہی ایک نزقی یافتہ شکل ہے، لہذا وہ زندگی کے ارتقائی تغیرات کے لیے کسی بالاتر ذہن یا ذات باری کی کارفرمائی کا یقین ضروری نہیں سمجھتے لیکن معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا۔ اگر اس اصول کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ انسان کائنات کے کارخانہ میں ایک عارضی اور اتفاقی شے ہے جو فطرت کی اندھی قوتوں کی تخلیق ہے۔ وہ فطرت کے ہاتھ میں ایک بے بس کھلونا ہے جس سے وہ جس طرح چاہتی ہے کھیلتی رہتی ہے اس میں کوئی غم اور ارادہ نہیں، وہ مادہ کے تعقبات کا اسی طرح پابند ہے جس طرح کہ جمادات۔ وہ بیشک اپنے آپ کو فطرت کے مقاصد کا نگہبان خیال کرتے رہے مگر یہ شخص اس کی ابد فریبی ہے حقیقت میں اس کا علم اور اس کے عزائم فطرت ہی کے آفریدہ ہیں اور اس لحاظ سے اس کا مقصد بھی مادہ کے لیے جس قرات کی کارفرمائی کا بالکل فطری نتیجہ ہے۔ جب ہم اپنی تخلیق کی علت اولیٰ مادہ کو قرار دیتے ہیں تو پھر ہمیں بلا تامل یہ مان لینا چاہیے کہ ہم فطرت کی کوشش ساز یوں کے غیر متعلق تماثلی ہیں۔

آپ اگر مادیوں کے سامنے انسان کو اس بے بس حیثیت سے پیش کریں تو وہ خود ا کا نور پر قائم رکھ لیں گے اور کہیں گے کہ انسان کو مجبور محض تو خدا کا قصور بنانا ہے، ہم تو اس کو بالکل خود مختار سمجھتے ہیں مگر یہ صرف فریب نظر ہے۔ اُن کے ہاں عجیب و غریب الجھن یہ پیش آتی ہے کہ وہ اپنے مقدمات کی بنیاد تو بلا تکلف مادہ پر قائم کرتے ہیں مگر ان بنیادوں پر استدلال کی جوریاریں اٹھائی جاتی ہیں اور

اُن پر افکار و نظریات کے جو محل تعمیر ہوتے ہیں انہیں یہ حضرات اپنانے پر کبھی تیار نہیں ہوتے۔ ان کی کج فہمی اور بٹ و دھرمی کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ایک طرف تو وہ انسانی شعور کو محض سالمات کی کوشد سازی سمجھتے ہیں مگر دوسری طرف اس نظریہ کو کہ انسان مجبور محض ہے، جو در حقیقت اُن کے اپنے مقدمات کا ہی نتیجہ ہے، کبھی تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے اور اس کے برعکس اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ شعور جس کی پیدائش صرف سالمات کے ہاتھوں سے ہوئی ہے وہ عالم طبعی اور اس کی قوتوں پر اپنے تصورات عائد کرتے ہیں جو قوانین کہلاتے ہیں اور پھر اُس کی مدد سے اُسی فطرت کو مستحضر کرتا ہے جس کی وہ خود نہ صرف پیداوار ہے بلکہ جس کے ہاتھ میں ایک کٹھن پتی ہے اور اپنے نکر و عمل کو اسی کے اشارہ ابرو سے معین کرنے پر مجبور ہے۔

یہ وہ مقام ہے جس پر قرآن حکیم ہیں انسان کی تخلیق کے بارے میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے وہ یہ کہتا ہے کہ انسانی زندگی کو بے جان اور بے حس مادہ پیدا نہیں کر سکتا بلکہ یہ کسی مدبر کی تدبیر کی رہین منت ہے جس نے ایک خاص منصوبہ کے تحت اس کے مختلف اعضا کے درمیان تناسب پیدا کیا اور انہیں اہمیت کے اعتبار سے مختلف فرائض سونپے۔ پھر اسی ذات نے کیلیم، لوہے، کاربن کے اس پیکر میں زندگی پیدا کی اور اس طرح اُسے مرگرم عمل کیا۔ اس کے بعد اُس نے اُس کے اندر ذہن و شعور کی شمع جلائی تاکہ وہ خالق کائنات کی آیات کو نظر امعان دیکھے۔ کانوں سے اس کے احکام کو توجہ و شوق سے سنے، دل سے انہیں ٹھیک ٹھیک سمجھنے کی کوشش کرے اور پھر اپنے مالک کو پہچان کر اُس کا شکر بجالائے۔

آئیے اب ایک نظر ان آیات پر بھی ڈالیں جن میں انسان کو آفاق پر غور کرنے کی تلقین کی گئی ہے کیونکہ فطرت کے جمال میں ہی حیرت ازل کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ پہاڑوں اور جنگلوں کی خاموش گویائی پکار پکار کر انسان کو ایک خالق کے وجود کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ سورج کی خشکیں کرنوں میں نسیمِ صحر

کے جھوٹوں میں، چاند کی ٹھنڈک میں، صبح کی صباحت اور شام کی ملاحشت میں اُسے آیاتِ الہی نظر آتی ہیں۔ وہ یہ باور ہی نہیں کر سکتا کہ یہ ساری کائنات جو اتنی منظم ہے، جس کے رنگارنگ مظاہر میں ایک نہایت گہرا ترتیب موجود ہے، بغیر کسی خالقِ اکبر کے پیدا ہو گئی ہے۔ یہ تاروں بھرا آسمان، یہ برفیلوں زمیں، یہ سورج، یہ چاند، یہ درخت، یہ سمندر، یہ پہاڑ، یہ لاکھوں کروڑوں جاندار اور بے جان اشیاء، یہ علل و اسباب کا غیر منقطع تسلسل، یہ تغیر و انقلاب کا حیرت انگیز نظام، قدم قدم پر اپنی کرشمہ زائیسوں سے انسان کے دامنِ دل کو کھینچتا ہے اور انسان بالکل بے اختیار ہو کر ہکا بھکا اٹھتا ہے۔

فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ۔

مناظرِ فطرت کی ان روشن آیات کے متعلق یہ احساس ہر زمانے کے ادب میں نہایت عمدہ جواہر پاروں میں ملتا ہے۔ سعدی اس احساس کی ترجمانی میں یوں نغمہ سرا ہوا ہے:

برنگ درختان بریز و در نظر پوشیار
ہر در رفت و در فرست معرفت کردگار

ربو (RIBOT) نے اپنی کتاب "نفیات جذبات" میں افریقہ کے ایک وحشی کے مذہبی خیالات نقل کیے ہیں۔ آپ ان احساسات کو ملاحظہ کیجیے اور دیکھیے کہ یہ فطرت سے کس قدر قریب ہیں:

"بارہ برس کا ذکر ہے کہ میں اپنا گلہ چرانے کے لیے گیا، دھند لگا چاروں طرف پھیلنا ہوا تھا۔ میں ایک چٹان پر بیٹھ گیا اور اپنے دل سے غم انگیز سوالات پوچھنے لگا۔ غم انگیز اس وجہ سے کہ میں ان کا کوئی جواب نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے اپنے دل سے پوچھا کہ تاروں کو کس نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے؟ آسمان کس ستون پر قائم ہے، دیا کے پانی کو دیکھو کہ کبھی نہیں ٹھنکتا ہے ہی چلا جاتا ہے صبح سے شام اور شام سے صبح تک بس اس کا یہی کام ہے؟ آخر یہ کہاں جا کر مکتا ہے اور اسے کون بہا رہا ہے۔ بادلوں ہی کو دیکھو کہ آتے جاتے رہتے ہیں، کبھی کسی پانی برساتا ہے میں۔ آخر وہ کہاں سے آتے ہیں انہیں کون بھجتا ہے؟ ہمارے ہجاری تو پانی برساتا نہیں سکتے اس لیے کہ میں نے کبھی انہیں برساتا نہیں دیکھا ہے۔ آخر اسے کون بھجتا ہے میں ہوا

کو نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن آخر وہ کیا چیز ہے، اُسے کون چلاتا ہے؟ ان سوالات کا جواب مل
سے نہ پا کر میں نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے چھپایا۔

اسرارِ کائنات کے متعلق عقل و خود کی یہ بے چینی جو آگے چل کر عقیدے اور ایمان پر منتج ہوتی ہے
صرف افریقہ کے اس وحشی ہی تک محدود نہیں بلکہ یہ انسان کی ایک فطری غلش ہے جسے دُور کرنے کے لیے
برآمدی مضطرب اور پریشان رہتا ہے۔ ہمارے ملک کا مایہ ناز شاعر جسے زندگی میں غم دوراں سے کم ہی مرت
نصیب ہوئی، وہ بھی فطری حیرت سے پوچھتا ہے: ۵

لالہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟

اب کیا چیز ہے؟ ہو کیا ہے؟

یہ خیال فکر و احساس رکھنے والے انسان کا ایک بالکل فطری سوال ہے اور اس سوال ہی کی
بدولت انسان کو حقیقت کی طرف صحیح رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ اُسے اگر اس کا تشفی بخش جواب نہیں ملتا
تو وہ لاادری یا کھوکھلے سر ہو جاتا ہے جو خود اثبات واجب الوجود کی ایک سببی شکل ہی ہے

سمجھا ہے پرے تجھ کو اِرداک کی مرحد سے

جس قدم نے رکھا ہے انکار روائتِ سرا

اسی نوعیت کا ایک ناثر صاحب ہدایہ نے اپنی کتاب تعلیم المتعلم میں نقل فرمایا ہے۔ علامہ رحمۃ اللہ
تعلیم و تدیس کے فطری اصولوں پر گفتگو کرتے ہوئے ایک فلسفی کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ وہ منطقی طریقہ
استدلال کے ذریعہ وجود باری تعالیٰ کا کھوج لگانے سے جب اکتا گیا تو آشفقت سر ہو کر صحرا کی جانب نکل
گیا اور اپنے دل میں کہنے لگا کہ خدا کو آخر حکما اور فلاسفہ ہی تو نہیں مانتے اس کی ذات پر وہ لوگ بھی ایمان
رکھتے ہیں جنہیں زندگی میں کبھی بھی رسمی تعلیم حاصل کرنے کا موقع میسر نہیں آتا۔ ایسے افراد اس ذات کے
وجود کے لیے کیا دلائل پیش کرتے ہونگے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اتنی دیر میں اُس کے پاس سے ایک
گڈیا گزرا فلسفی نے اُسے روک لیا اور کہا کہ تم نے کیا سوچا؟ گڈیے نے جواب دیا بے شک

فلسفی نے دریافت کیا۔ اس کا تہا رہے پاس کیا ثبوت ہے؟ اس پر گڈریے نے اپنی بدویانہ زبان میں یہ کیا:

اَلْبَعْرُ يَدُلُّ عَلَى الْمَجْدِ وَالْاَشَدُّ
يَدُلُّ عَلَى الْمُسِيرِ قَالَا مَرْضٌ ذَات
فُجَاءِ وَالسَّمَاءُ ذَاتُ بُرُوجٍ اَفَلَا تَدُلُّ
عَلَى الْعَلِيِّ الْعَدِيرِ؟
اونٹ کی گھنٹیاں ہیں تو تیرا چل جانا ہے کہ اونٹ گزر رہا
نقوش پا رہا نور و کا پتہ دیتے ہیں۔ تو اب کیا یہ کشادہ
راستوں والی زمین اور یہ برجوں والا آسمان ایک برتر
دعا و ذات کی شہادت نہیں دیتے؟

گڈریے کے ان الفاظ میں ہر شخص خالق کائنات کے بارے میں انسان کے فطری سوال کا فطری جواب
دیکھ سکتا ہے۔ ان میں ایک ایسی حکمت اور دانائی موجود ہے جس پر ہر مسلم الفطرت انسان کا دل خود گواہی
دیتا ہے۔

قرآن مجید اسی طرز استدلال سے انسان کو حقیقت تک پہنچاتا ہے وہ اسے بار بار اس بات کی
تلقین کرتا ہے کہ وہ اس کائنات میں پھیلی ہوئی آیات الہی پر غور کرے تاکہ وہ ایک صحیح نتیجہ تک پہنچے
میں کامیاب ہو۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ
اِخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي
الْاَبْصَارِ۔ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّ
نُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَّيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات دن کے
باری باری سے آنے میں ان ہوشمندوں کے لیے
بہت نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے اور بیٹھے ہر حال میں
خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی ساخت پر غور و
فکر کرتے ہیں۔

یہ نیکیوں آسمان کی چھت، یہ زمین کا سبزہ زار فرش اور ایک ہی حرکت سے شب و روز کا انقلاب
ایک خالق کل کا پتہ دیتا ہے اور انہیں دیکھ کر ہر شخص باسانی حقیقت تک پہنچ سکتا ہے بشرطیکہ وہ خدا سے
غافل نہ ہو اور آثار کائنات کو غافلانہ نہ دیکھے کہ ساکھ شاہدہ کرے۔ (بقیہ صفحہ ۱۷)